عوامی منصب کی اہلیت وانتخاب سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

(The eligibility and selection of a public office in the light of Seerat-e Nabvi)

ڈاکٹر نعیم انور الازہری [1]

Abstract:

History of designation and authority goes back to the start of this Universe. The best example is the faculty of Prophets (A.S). The prophets are unparallel, not only in their personality, rather they have been made beacon house for guidance. Muhammad (SAW) has been declared as the best example for all corners of life including the administrative authorities of a country. Such persons have been ordained to comply with the assigned tasks strictly. They have been named as the men of authority among the believers (اولی الامر *) who give valne to the commandments of Allah and his apostle while performing their duties. In this article, it has been highlighted what authority is, what are its responsibilities and what are Islamic injunctions pertaining to the people provided with authority to rule over the masses.*

باری تعالیٰ نے انسان کو جس بھی نعمت اور عظمت سے نوازا ہے، وہ فطرتی طور پر انسان کے ضمیر کی آواز بن کر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس نعمت کا استعمال اور اس منصب کا تصرف اس طرح ہو کہ ایک طرف جہاں وہ مشیتِ ایزدی کا آئینہ دار ہو اور وہاں وہ سراسر انسانی منفعت پر منحصر ہو، حتیٰ کہ وہ منصب دوسروں کے لیے ایک راہنمائی اور تقلید کا باعث ہو، انسانیت اس منصب کے حامل شخص کو اپنے لیے ایک نجات دہندہ محسوس کرے اور اپنا سب سے بڑا خیر اہ تصور کرے، حتیٰ کہ اس کا وجود مایوسی کے اندھیروں میں ان کے لیے ایک چراغِ راہ کی حیثیت رکھتا ہو، اور اس کا وجود اس منصب کے حوالے سے عظمتِ رفتہ کی ایک نشانی ہو، ترقی کی علامت ہو اور دوسروں کے لیے وہ ایک عمدہ تقلید و پیروی کا نمونہ ہو۔

یقیناً اس طرح کا صاحبِ منصب ہمیں تبھی میسر آ سکتا ہے جب وہ ان اوصاف کا حامل ہو جو تاریخ انسانی کے ہر دَور میں قابلِ تقلید مناصب کے حامل افراد میں بکثرت پائے گئے ہیں، حتیٰ کہ ان کی تائید ہمیں علم بالوحی سے بھی میسر ہو اور علم بالکسب سے بھی اور علم بالتجربہ والمشاہدہ سے بھی، اور یوں جب صاحبِ منصب اعلیٰ صفات کا مالک ہوگا، تو اس کے وجود سے صادر ہونے والے افعال بھی اس کے عمدہ افکار کا ایک ثمر واقع ہوں گے، یوں ہم اپنے مقصود و مطلوب، صاحبِ منصب کو نہ صرف پا لیں گے بلکہ اس کے ذریعے وسائل اور ذرائع کے ذمہ دارانہ اور عادلانہ استعمال کو بھی حاصل کر لیں گے۔ اس حوالے سے صاحبِ منصب کے وجود میں درجہ ذیل صفات کا پایہ جانا ضروری ہے:

[1] اسسٹنٹ پروفیسر جی سی یونیورسٹی لاہور

کردار کی پختگی:

کسی بھی منصب پر فائز شخص کے لیے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ خود کو کردار کی دنیا میں مضبوط و مستحکم بنائے بلکہ خود کو اس حوالے سے بے مثال بنائے، اس لیے مناصب اور عہدوں کی وہ حکمرانی آج تک مسلّم رہی ہے جو دلوں میں فروغ پذیر ہوئی ہے، نہ کہ جو جبر و اکراہ کے ذریعے گردنوں پر قائم کی گئی ہے، جوں ہی جبر و اکراہ کے سائے دور ہوئے، لوگوں نے ایسے حامل مناصب کو نہ صرف قابلِ نفرت جانا بلکہ قابلِ تحقیر و تضحیک بھی سمجھا۔

اس لیے باری تعالیٰ نے مناصب کی عزت و تکریم کو دلوں میں قائم کرنے کے لیے ''ایک معیار کردار'' دیا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول　　　نے ''تقویٰ'' کا نام دیا ہے، گویا قرآنی اور نبوی اصطلاح میں اس کے کردار کا نام ''صالحیت و پرہیز گاری'' ہے، وہ کردار جو ہر طرح کی دنیوی طمع سے پاک ہوتا ہے اور اس کے اندر اگر کوئی طمع ہوتی ہے تو وہ صرف اور صرف اپنے مولا کی رضا و خوشنودی کو پانے کی ہوتی ہے۔

اس لیے قرآن مجید دونوں انداز میں واضح کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔(۱)

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بلاشبہ تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔''

قرآن ہر منصب کے لیے ایک معیار مقرر کرتا ہے اور ہر منصب کے لیے ایک کردار کا تعین کرتا ہے، اس معیار اور عملی کردار کا نام قرآن کی زبان ''تقویٰ'' ہے، گویا کسی بھی منصب کو اس کے تمام تر حقوق و فرائض کے تناظر میں ادا کرنے کے لیے ایک واضح اہلیت کا معیار ہے۔ جب اس منصب اور اہلیت کی موافقت اور مطابقت کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی ذمہ داری تفویض کی جائے گی، تو یقیناً ایسا صاحبِ منصب اپنی اہلیت کی بنا پر اور خداداد صلاحیت کی وجہ سے اس منصب کی تمام ذمہ داریوں کو اس طرح ادا کرے گا جو اس منصب کے واضح تقاضے ہیں۔ اس لیے کہ کوئی منصب اسی وقت منصب بنتا ہے، جب اس کی جملہ ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا کر دیا جائے، بصورتِ دیگر اس منصب کی دنیوی منفعت سے مستفید ہونا ہی باقی رہ جائے گا اور منصب محض ایک علامت ہوگی مگر وہ بنیادی صلاحیت سے محروم ہوگا، اس منصب کے ذریعے لوگوں کی منفعت نظر نہیں آئے گی، البتہ اس منصب سے ذاتی منفعت کی ہر صورت دکھائی دے گی۔

ایسی منصب داری کو اسلام نے نااہلیت اور عدم امانت سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے منصب دار سے قوم کی اجتماعی وحدت اور اجتماعی مفادات کو نقصان پہنچتا ہے۔

معیارِ انتخاب قابلِ اعتبار ہو:

اسلام کسی بھی منصب کے ذمہ داران کے تعین کے لیے انتخاب کا ایک نظام عطا کرتا ہے۔ کسی بھی منصب کے انتخاب کو سب سے پہلے عادلانہ اور منصفانہ بنانا ضروری ہے، کسی بھی منصب کی ذمہ داریوں کی حسن ادائیگی کے لیے یہ ایک پہلی شرط ہے۔ جب اس شرط کو تمام تر تقاضوں کے ساتھ ادا کیا جائے، صاحبِ اہلیت کو تلاش بسیار کے بعد صاحبِ منصب کیا جائے، تو نتائج و ثمرات کا ظہور یقینی ہو جاتا ہے۔

اگر انتخاب کی بنیاد ہی نااہلیت اور سفارش ہے، قرابتداری ہے، دوستی وتعلق داری ہے، دنیوی حرص وطمع ہے، ذاتی مفاد ہے، تصورِانتخاب، تعصب وعصبیت پر مبنی ہے، ذاتی پسند اور ناپسند پر استوار ہے۔ علاوہ ازیں تصور انتخاب قومی مفادات کی بجائے ذاتی مفادات کے گرد گھومتا ہے، تو اس کا نتیجہ بڑا ہی واضح ہے، پہلی اینٹ ہی عمارت کی کمزوری کی وجہ بن جائے گی۔

قرآن مجید نے تصورِ انتخاب کو سراسر اہلیت وصلاحیت اور قابلیت کے مطابق بنانے کے لیے اس آیت کریمہ کے ذریعے راہنمائی دی ہے: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ ۔(۲)

''اللہ تعالیٰ نے اسے تم پر منتخب کرلیا ہے۔''

اس آیت کریمہ میں '' اصطفه عليكم '' کے الفاظ اس جانب متوجہ کررہے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے اسے تم پر منتخب کرلیا ہے۔۔'' یقیناً اللہ کا انتخاب اس کی مشیت پر منحصر ہے اور اس انتخاب کا سیدھا سا مفہوم تو یہی ہے، اور ہم اپنے ربّ کے بارے میں یہی جانتے ہیں، وہ علیم بذات الصدور کا مالک ہے اور اس کی شان ''علیم خبیر'' کی بھی ہے اور وہ اپنے بندوں کو یہ بھی فرماتا ہے: ''انی اعلم مالا تعلمون'' (میں وہ کچھ جانتا ہوں جس کے بارے میں تم کو کچھ بھی معلوم نہیں) یقیناً اس علیم وخبیر ربّ کا انتخاب سراسر ایک ''بے مثال معیار'' ہے۔ جس کے عملی شواہد ہر دَور میں ایک حقیقتِ مسلمہ کے طور پر خود کو منوا چکے ہیں۔

اندریں حالات میں پھر بھی انسانی ذہن کیوں؟ اور کس بنا پر؟ کی تلاش میں اپنی علمی تسکین ضرور چاہتا ہے۔ باری تعالیٰ نے انسانی ذہن میں اُٹھنے والے اس سوال کو بھی اُدھورا نہیں چھوڑا اور اس کا جواب آیتِ کریمہ کے ان الفاظ کے ذریعے سے دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۔(۳)

''اسے علم اور جسم میں زیادہ کشادگی عطا کی ہے۔''

وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۔(۴)

''اور اللہ اپنی سلطنت کی امانت جسے چاہتا ہے عطا فرمادیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور خوب جاننے والا ہے۔''

علمی بلندی اور شخصی مضبوطی:

اب آیتِ کریمہ کے ان کلمات کے ذریعے باری تعالیٰ نے اپنے معیارِ انتخاب کو بھی واضح کردیا ہے، کہ اس کے ہاں کسی بھی عہدے کے لیے انتخاب کی بنیاد علمی پختگی اور جسمانی مضبوطی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اور بھی صفات ہیں جن کی بنا پر کسی کو اس عہدے کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس ضابطے کو اس آیت کریمہ کے ان الفاظ کے ذریعے واضح کیا ہے:

وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۔(۵)

''اور اللہ اپنی سلطنت کی امانت جسے چاہتا ہے عطا فرمادیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور خوب جاننے والا ہے۔''

وہ اپنی سلطنتِ امانت کی نعمت ایسے پیکرِ صفات کو منتقل کرتا ہے جو ان دو لازمی خوبیوں کے ساتھ ساتھ دیگر خوبیوں سے بھی آراستہ ہوتے ہیں۔ وہ دیگر خوبیاں کیا ہیں، جو معیارِ اہلیت، انتخابِ عہدہ اور قابلیتِ منصب، کی بنیاد بنتی ہیں، ان کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا: ''واللّٰہ واسع علیم۔'' وہ ان خوبیوں کو اپنے علم کی کثرت وفراوانی کی بنا پر خوب جانتا ہے۔

آیت کریمہ کے ان الفاظ سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کسی عہدے کے انتخاب کے لیے اس علم کے ماہرین کی آراء کو بھی مدنظر رکھا جائے، کچھ چیزوں کا ذکر ایک عمومی معیار کی حد تک لازمی ہو، اس کے علاوہ بہت سی چیزوں کو اس شعبے کے ماہرین اپنی علمی وسعت اور تجربے کی کثرت کی بنا پر از خود جوہرِ قابل کا انتخاب کرلیں گے۔

گویا قرآنی اور نبوی معیار کے مطابق کسی بھی عہدے کے انتخاب کے لیے لازمی شرائط کسی بھی شخص کا ''زادہ بسطۃ فی العلم والجسم۔'' ہونا ضروری ہے۔ باری تعالیٰ نے یہ معیارِ انتخاب اس عمومی معیار کے انتخاب کے مقابلے کے طور پر دیا ہے۔

حکومتی منصب کا معیارِ انتخاب۔۔۔ دولت نہیں، علم ہے:

جب بنی اسرائیل پر حضرت طالوت علیہ السلام کو بادشاہ مقرر کیا گیا، تو انہوں نے ان کے معیارِ انتخاب پر اعتراض کیا۔ اپنے اعتراض کے حوالے سے یوں گویا ہوئے:

قَالُوٓا اَنّٰی یَکُونُ لَہُ الْمُلْکُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْکِ مِنْہُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَۃً مِّنَ الْمَالِ۔ (٦)

''کہنے لگے، اسے ہم پر حکمرانی کیسے مل گئی، حالانکہ ہم اس سے حکومت کرنے کے زیادہ حقدار ہیں، اسے تو دولت کی فراوانی بھی نہیں دی گئی۔''

اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کا حضرت طالوت کے انتخاب میں بنیادی اعتراض یہ تھا، کہ یہ ہم پر حکمرانی کا حق نہیں رکھتا، اور اس لیے کہ یہ حکمرانی کے معیارِ انتخاب پر پورا نہیں اترتا، ہم جب خود کو اور اسے باہم موازنہ کرتے ہیں، اور باہم ایک دوسرے کا تقابل کرتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ حقِ حکمرانی کے لیے ہم اس سے زیادہ قابل اور اہل ہیں جبکہ یہ اس معیار قابلیت سے ہی محروم ہے اور اس بنا پر منصب پر فائز کیے جانے کا حقدار نہیں ہے۔ ان کے نزدیک معیارِ انتخاب کیا ہے، اسے بھی باری تعالیٰ نے بیان کردیا ہے، وہ کہتے ہیں:

وَلَمْ یُؤْتَ سَعَۃً مِّنَ الْمَالِ۔ (٧) ''وہ مال ودولت کی کثرت اور فراوانی سے محروم ہے۔''

اور مفلوک المال ہے۔ جبکہ ہم اس سے زیادہ مال ودولت رکھنے والے ہیں، تو گویا ان کے نزدیک منصب بادشاہت پر فائز ہونے کے لیے معیارِ انتخاب ''مال ودولت کی کثرت'' ہے، اور حضرت طالوت علیہ السلام ان کے معیار پر پورا نہ اترتے تھے، اس بنا پر انہوں نے خود کو ان کی نسبت زیادہ اہل اور قابل سمجھا۔

باری تعالیٰ نے ان پر واضح کردیا کہ کسی بھی عہدے اور بالخصوص منصبِ بادشاہت پر انتخاب کے لیے یہ تمہارا وضع کردہ معیارِ انتخاب ہے، جبکہ میرا معیار انتخاب مال ودولت کی کثرت نہیں بلکہ علم کی ثقاہت اور کثرت ہے اور جسمانی وجاہت ہے، اور انتخاب کے اس معیارِ الوہیت پر تم میں سے صرف اور صرف حضرت طالوت علیہ السلام ہی پورا اترتے ہیں۔

اس آیہ کریمہ نے یہ بات واضح کردی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں کسی بھی منصب کے انتخاب کے لیے بنیادی اہلیت وقابلیت علم کی پختگی اور جسمانی مضبوطی ہے، اللہ کے نزدیک دولت کی کثرت معیارِ انتخاب نہیں ہے۔

اس قرآنی تصور سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جب دولت معیارِ انتخاب نہیں اس کی حرص اور چاہت انسان کی اہلیت کو

نااہلیت میں بدل دیتی ہے اور انسانی قابلیت کو داغدار کردیتی ہے، اور فقط اور فقط اسی کا حصول ہی انسان کو عہدے اور منصب سے بھی محروم کردیتا ہے۔

منصب کی ضروریات، حکمت ودانائی اور قوتِ فیصلہ:

کسی بھی منصب کا ذمہ دارانہ استعمال ہو یا اس منصب کی وجہ سے حاصل ہونے والے اختیارات اور ذرائع کا استعمال ہی کیوں نہ ہو، یہ ذمہ داری اپنی مثالی صورت میں اس وقت ڈھلتی ہے جب انسان اپنے وجود کو دو خوبیوں سے آراستہ کرلیتا ہے، جسے باری تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یوں بیان کیا ہے:

وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔(۸)

''اور ہم نے ان کے ملک وسلطنت کو مضبوط کردیا تھا اور ہم نے انہیں حکمت ودانائی اور فیصلہ کن انداز خطاب عطا کیا تھا۔''

اس آیت کریمہ میں باری تعالیٰ استعارۃً ''ملک'' کو مضبوط کرنے کا ارشاد فرمارہا ہے جسے امر واقع میں وہ منصب مراد ہے جس پر فائز شخص کو باری تعالیٰ نے حکمت ودانائی سے نوازا ہے اور محکم قوتِ فیصلہ سے سرفراز کیا ہے، جس کی بنا پر اس کے ملک وسلطنت کو استحکام ودوام ملا ہے، اور اس کی سلطنت کو مضبوطی اور خوشحالی میسر آئی ہے جس کی بنیادی ایک وجہ ہے: ''واتینه الحکمة'' حکمت ودانائی ہے اور دوسری وجہ ''وفصل الخطاب'' ہے۔ اس منصب پر فائز شخص کو باری تعالیٰ نے ان دو بنیادی صلاحیتوں کی وجہ سے استحکام منصب کی نعمت سے نوازا ہے۔ ''وشددنا ملکه'' کی بنیاد ان دو صلاحیتوں کو قرار دیا ہے جو اس میں بدرجہ اُتم موجود ہیں۔

بلاشبہ حکمت ودانائی ہی کسی صاحبِ منصب کو دوسروں سے ممتاز ومنفرد کرتی ہے۔ حکمت سے مراد دانائی ہے یعنی ہم نے ان کو عقل وفہم کی دولت بخشی تھی (۹) اور یہی وہ دولت ہے جس کی بنا پر انسان اشیاء کی حقیقتوں سے آگاہ ہوتا ہے اور معارف وحقائق کا ادراک کرتا ہے، وہ بصارت سے بصیرت کا سفر طے کرتا ہے، اور بصیرت سے فراست تک پہنچتا ہے، جس کے لیے رسول اللہ نے حدیث مبارکہ میں ارشاد فرمایا:

اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور اللّٰہ۔(۱۰)

''مؤمن کی فراست سے ڈرو، اس لیے وہ اللہ کے نور سے اشیاء کا ادراک کرتا ہے۔''

وفصل الخطاب آیت کے ان الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے مفتی محمد شفیع بیان کرتے ہیں کہ فصل الخطاب کی مختلف تفسیریں بیان کی گئی اس سے مراد زورِ بیان اور قوت خطابت ہے، جیسا کہ باری تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اعلیٰ درجے کا خطیب بنایا تھا اور خطبوں میں حمد وصلوٰۃ کے بعد سب سے پہلے ''امابعد'' کے الفاظ انہوں نے ہی استعمال کیے تھے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ فصل الخطاب سے مراد بہترین قوت فیصلہ ہے۔ یعنی باری تعالیٰ نے آپ کو جھگڑے چکانے اور تنازعات کا فیصلہ کرنے کی قوت عطا فرمائی تھی۔ درحقیقت ان الفاظ میں بیک وقت دونوں معنی کی پوری گنجائش ہے اور یہ دونوں باتیں ہی مراد ہیں اور یہ دونوں معنی ہی اس میں سماسکتے ہیں۔(۱۱)

غرضیکہ کسی بھی منصب کی کامیابی کے لیے دو چیزیں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ایک منصب کے حوالے سے علم وحکمت اور دانائی ہے اور دوسری اس منصب کے حوالے سے قوت فیصلہ اور قوت قضا ہے، اس کا لازمی نتیجہ ''وشددنا ملکہ'' کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہمیں منصب اور اس کے اختیارات کے ذمہ دارانہ استعمال سے پہلے اس منصب کے معیار انتخاب میں اہلیت وامانت کو تلاش کرنا

ہے۔جس کا باری تعالیٰ نے ہمیں قرآن میں حکم دیا ہے۔

منصب ایک قومی امانت ہے:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا۔(۱۲)

''بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو لوٹاؤ۔''

اس آیت کریمہ میں باری تعالیٰ نے لفظ''الامنت'' استعمال کیا ہے، یہ لفظ اپنے معنوی اطلاق کے حوالے سے اپنے اندر بڑی وسعت اور جامعیت رکھتا ہے۔علمائے تفسیر نے اس لفظ کی مراد میں تمام مناصب کو بطور خاص لیا ہے، حتیٰ کہ سب سے بڑے حکومتی منصب پر فائز کرنے کے لیے''ووٹ'' کو بھی اس سے مراد لیا ہے۔

مفتی محمد شفیعؒ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ اس آیت کے مخاطب عام مسلمان بھی ہیں اور خاص امراء اور حکام بھی، بلکہ زیادہ واضح بات یہ ہے ہر وہ شخص اس آیت کریمہ کا مخاطب ہے جو کسی بھی امانت کا امین ہے، خواہ اس کا تعلق عوام سے ہو یا خواص و حکام سے۔(۱۳)

مزید برآں بیان کرتے ہیں کہ امانت کے تحت حکومت کے تمام عہدے اور مناصب بھی آتے ہیں، بلاشبہ یہ سب اللہ کی امانتیں ہیں اور جن کے امین وہ حکام اور افسران ہیں جن کے ہاتھ میں عزل و نصب کے اختیارات ہیں اور ان کے لیے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کر دیں جو کسی بھی منصب کے لیے علمی اور عملی صلاحیت و قابلیت کا اہل ہی نہیں ہے۔ بلکہ ان پر لازم ہے کہ ہر کام اور ہر عہدہ کے لیے اپنے دائرۂ اختیار میں اس منصب کے مستحق کو تلاش کریں اور اگر کسی منصب کے لیے سب شرائط کو پورا کرنے والا کوئی نہ ملے تو موجود لوگوں میں سے قابلیت اور امانت داری میں فائق شخص کو ترجیح دی جائے۔(۱۴)

رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث مبارکہ میں فرمایا:

''جس شخص کو مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی و تعلق میں بغیر کسی اہلیت کے دے دیا، تو اس پر اللہ کی لعنت ہے، اس کا نہ فرض قبول ہوا نہ ہی نفل، یہاں تک وہ دوزخ میں داخل ہو جائے۔''(۱۵)

اسی طرح صحیح بخاری کتاب العلم میں امام بخاریؒ ایک حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا وصل الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ۔(۱۶)

''جب یہ دیکھو کہ مسلمانوں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد کی گئی ہے جو اس کام کے اہل و قابل نہیں ہیں، تو پھر آپ قیامت کا انتظار کرو۔''

امام قرطبی اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ھذہ الآیۃ من امھات الاحکام تضمنت جمیع الدین و الشرع و الاظھر فی الآیۃ انھا عامۃ فی جمیع الناس فھی تتناول الولاۃ فیما الیھم من الامانات فی قسمۃ الاموال و رد الظلامات و العدل فی الحکومات۔(۱۷)

''یہ آیت کریمہ قرآن حکیم کے اہم ترین احکام میں سے ہے، اس کے ضمن میں دین و شریعت کی تمام تر تفصیلات کو بیان کر دیا گیا ہے۔۔۔مزید برآں کہتے ہیں اس آیت کا اطلاق عام لوگوں کے حق میں بھی ہے اور بطور خاص صاحب مناصب لوگوں کے حق میں بھی ہے کہ وہ ذرائع و اموال کے تقسیم و استعمال میں، ظلم و ناانصافی کو ختم کرنے میں، اور عدل و انصاف کو قائم کرنے میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا

کریں۔"

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ اس آیت کریمہ کی تفسیر کے باب میں بیان کرتے ہیں:

"ادائے امانت سے مراد یہاں صرف یہی نہیں ہے کہ آپ کسی شخص کے پاس کوئی چیز رکھیں اور وہ آپ کو جوں کی توں واپس کر دے بلکہ اس کا مفہوم وسیع تر ہے۔ عباوات بھی امانت ہیں ان کو صحیح وقت پر اخلاصِ نیت سے شرائط وقیود کی پابندی کے ساتھ ادا کیا جائے اور اگر آپ کو اقتدار وحکومت حاصل ہے تو غریب وامیر، قوی وضعیف میں مساوات قائم کریں، عدل کے ترازو کو تمام مخالف رجحانات کے باوجود قائم رکھیں اور حکومت کے عہدوں پر تقرر کے لیے کنبہ پروری اور دوست نوازی کی بجائے صرف اہلیت وقابلیت کو ہی معیار قرار دیں۔ یہ سب معانی اس آیت کریمہ میں داخل ہیں۔" (۱۸)

منصب کا ذمہ دارانہ استعمال:

منصب ہو یا اس کی وجہ سے ملنے والے اختیارات ہوں، یا اس منصب کی بنا پر ملنے والے وہ تمام ذرائع ہی کیوں نہ ہوں، یہ سب ایک امانت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امانت اسی وقت تک امانت رہتی ہے جب وہ اپنے استعمال وتصرف میں خیانت سے محفوظ رہے، خیانت درحقیقت منصب اور اس کی وجہ سے ملنے والے ذرائع کے ناجائز استعمال سے ہی متحقق ہوتی ہے۔ اس لیے باری تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ادائیگی امانت کا حکم دیا ہے اور خیانت سے بچنے کی تاکید کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضاً فَلْيُؤَدِّ الَّذِيْ اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّه۔ (۱۹)

"اور پھر اگر تم میں سے ایک کو دوسرے پر اعتماد ہو، تو جس کی دیانت پر اعتماد کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ اپنی امانت ادا کردے اور وہ اللہ سے ڈرتا رہے جو اس کا پالنے والا ہے۔"

امانت ہمیشہ ادائیگی کا تقاضا کرتی ہے۔ اس ادائیگی کی روح اور اس امانت کی ادائیگی کا جذبہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی ہے۔ یہ احساس جب انسانی ذہن وقلب میں پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں ایک زندہ کردار ظاہر ہوتا ہے جو اپنے باطنی حسن کی وجہ سے ہر کسی کو دلکش لگتا ہے۔

امانت کے احساس کے مرنے سے خیانت کا احساس پیدا ہوتا ہے، جو اس ارفع کردار کو داغدار کر دیتا ہے، اور اسے اعلیٰ اور بلند مرتبے سے گرا دیتا ہے۔ اس لیے اہل ایمان کو متوجہ کرتے ہوئے خیانت سے منع کر دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (۲۰)

"اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے حقوق کی ادائیگی میں خیانت نہ کیا کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں خیانت کیا کرو، حالانکہ تم (سب یہ حقیقت) جانتے ہو۔"

اس آیت کریمہ میں حقوق اللہ وحقوق الرسول اور حقوق العباد کے تناظر میں جتنی بھی خیانت، امانت کے باب میں ہو سکتی تھی اس ضمن میں خیانت کی تمام صورتوں سے کلیۃ ممانعت کر دی گئی ہے۔ اس لیے خیانت، امانت کی متضاد ہے اور امانت، خیانت سے جدا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق اور دین کی ساری تعلیمات کا تقاضا امانت کی کماحقہ ادائیگی کا ہے۔ یقینا منصب اور اس کے جملہ ذرائع ایک صاحب عہدہ شخص کے پاس ایک قومی امانت ہیں اس کا جائز اور درست استعمال ہی ادائیگی امانت ہے اور ان کا ناجائز اور حرام استعمال خیانت کا مرتکب کرتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو جھٹلانے کا سبب بنتا ہے۔ اس لیے خیانت نہ

صرف تکذیب کا نام ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کھلی معصیت کا نام ہے۔اس لیے اس راہ پر چلنے سے ہی منع کر دیا ہے۔ اس لیے خیانت کا ارتکاب نہ شعارِ اسلام ہے اور نہ شعارِ مسلم ہے، بلکہ اہلِ ایمان کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ وعدوں وعہدوں اور امانتوں کی رعایت کرنے والے ہیں اس لیے باری تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ۔(۲۱)

''ایمان والو! کی نشانی اور علامت ہی یہی ہے کہ وہ اپنی امانتوں اور عہدوں کو پاسداری کرتے ہیں۔''

امانت درحقیقت وعدے اور عہد کی تکمیل کا نام ہے۔''راعون'' کے الفاظ کے ذریعے امانت اور عہد کی پابندی کے تناظر میں رعایت کا خیال کیا جا رہا ہے۔ہر ایک سلیم الفطرت شخص امانت کو قبول کرتا ہے اور اسی قبولیت سے احساس ذمہ داری کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔

رعایت کا یہی تصور جب بڑھتا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اس بڑھتے ہوئے احساس کو معاشرے کے ہر طبقے پر منطبق کیا ہے۔اس لیے حدیثِ مبارکہ میں یوں آتا ہے۔ارشاد رسول اللہ ﷺ ہے:

عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، ان رسول اللہ قال کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته فالامیر الذی علی الناس راع وھو مسئول عنھم والرجل راع علی اھل بیته، وھو مسئول عنھم والمرأة راعیة علی بیت زوجھا وولدہ وھی مسئولة عنھم والعبد راع علی مال سیدہ، ھو مسئول عنه الا فلکلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته۔(۲۲)

اس حدیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے معاشرے کے امیر سے لے کر گھر کے مرد، عورت اور غلام تک سب کو ذمہ دار بنایا ہے، اگر آج ہم میں سے ہر شخص اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرے تو یہ معاشرہ اور یہ ملک وسلطنت اور یہ تمام شعبہ ہائے حیات سنور سکتے ہیں۔

معاشرے میں اعتدال وتوازن پیدا ہوسکتا ہے، اور قوم دنیا بھر کی اقوام میں عزت وعظمت، وقار وتمکنت کی منزل کو پاسکتی ہے۔اس لیے ہم میں سے ہر شخص کو یہ تصور اپنے ذہن میں راسخ کرنا ہے کہ

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

خلاصۂ کلام:

اگر ہم عصرِ حاضر میں قرآن اور نبوی تعلیمات کو اپنے پیش نظر رکھیں اور اپنے معیارِ انتخاب کی اصلاح کریں، اور اس معیار انتخاب کو ایک حقیقت بنا دیں۔۔۔ایسی حقیقت جس میں صرف اور صرف اہلیت اور قابلیت کی بات ہو، جس میں صلاحیت واستعداد کی تحسین ہو، جس میں جوہر قابل کی تلاش ہو، جس میں ہر طرح کے معاشرتی وسیاسی، خاندانی اور برادری کے اثر ورسوخ نہ ہوں، جس میں کسی بڑے سے بڑے کی سفارش کا عمل دخل نہ ہو، تو یقیناً ایسا معیارِ انتخاب نتائج دیتا ہے اور قوم کی مایوسی کو دُور کرتا ہے اور وہ عہدوں کا استعمال اور ذرائع کا استعمال بطور قومی ودینی امانت کے کرتا ہے اور ایسا معیارِ انتخاب خود کو ہر وقت احتساب کے لیے تیار رکھتا ہے، خواہ وہ احتساب اللہ کے سامنے ہو یا اللہ کی مخلوق کے سامنے، اور یہی تصورِ احتساب منصب وعہدہ کے استعمال اور ان کے ذرائع کے استعمال میں ایک ذمہ دارانہ تصور پیدا کرتا ہے، جس سے ایک زندہ اور قابل تقلید کردار کا تصور معاشرے کے سامنے آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سورہ الحجرات ۴۹:۱۳
۲۔ سورہ البقرہ ۲:۲۴۷
۳۔ ایضاً
۴۔ ایضاً
۵۔ ایضاً
۶۔ ایضاً
۷۔ ایضاً
۸۔ سورہ ص ۳۸:۲۰
۹۔ معارف القرآن، مفتی محمد شفیع، ادارۃ المعارف، کراچی ۱۹۲۴ء، ج ۷ ص ۴۹۷
۱۰۔ احمد بن حنبل، مسند، ج ۱۰ ص ۱۵۵
۱۱۔ معارف القرآن، مفتی محمد شفیع، ادارۃ المعارف، کراچی ۱۹۲۴ء، ج ۷ ص ۴۹۷
۱۲۔ سورہ النساء ۴:۵۸
۱۳۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ادارہ معارف القرآن، کراچی ۱۹۷۶، ج ۲ ص ۴۴۶
۱۴۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ج ۲ ص ۴۴۶
۱۵۔ جمع الفوائد، ص ۳۲۵
۱۶۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، رقم الحدیث ۵۹
۱۷۔ امام قرطبی، تفسیر قرطبی، سورہ النساء، فی تفسیر ہذہ الآیہ۔
۱۸۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ج ۱ ص ۳۵۵
۱۹۔ سورہ البقرہ ۲:۲۸۳
۲۰۔ سورہ الانفعال ۸:۲۷
۲۱۔ سورہ المؤمنون، ۸
۲۲۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الصحیح البخاری، مکتبۃ الرشد، بیروت، رقم الحدیث: ۵۱۸۸